ملفوظات اقبال

یوسف سلیم چشتی

تمہید : علامہ اقبال مرحوم سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔ ان سے ملاقات کی تقریب اسطرح پیدا ہوئی کہ اس زمانے میں مجھے فلسفہ، الہیات اور علم کلام کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان تینوں علوم میں ہستیٔ باری کا مسئلہ بنیادی اور سر فہرست ہے لیکن کانٹ نے اپنی ''تنقید عقل خالص،، میں اثبات واجب الوجود پر جسقدر اولہ حکماء اور متکلمین نے قائم کی ہیں، سب کا ابطال کر دیا ہے اسلئے میں حضرت علامہ سے ملنے گیا اور ان سے عرض کی کہ کیا آپ کے ذہن میں اثبات واجب پر کوئی ایسی دلیل ہے جو ناقابل رد ہو؟ انہوں نے کہا کہ عقل انسانی اس معاملے میں عاجز ہے۔ خدا کی ہستی کا یقین دلائل عقلیہ سے پیدا نہیں ہو سکتا اسکے لئے مشاہدۂ باطنی درکار ہے۔ عقل یہ تو بتا سکتی ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق یا صانع ہونا چاہیے لیکن اسکا اثبات نہیں کر سکتی کہ یہ بات اسکے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ اسلئے حکماء کی تقلید کے بجائے ارباب کشف و شہود یعنی صوفیائے کرام کی پیروی کرو بالفاظ دگر رازی کو چھوڑ کر رومی رح کو اپنا راہنما بناؤ۔

اس ملاقات کے بعد ان سے رسم و راہ کا سلسلہ قائم ہوگیا اور کچھ عرصے کے بعد میں نے ان کے کلام کا مطالعہ شروع کردیا۔ اس مطالعے کی بدولت مجھے انکی شخصیت سے بڑا لگاؤ پیدا ہوگیا۔ اور جہانتک ممکن ہوسکا میں نے ان سے استفادہ کیا۔ چونکہ وہ یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے ارشادات ان کے سامنے بیٹھکر قلمبند کروں اسلئے گھر واپس آکر جو کچھ ذہن میں محفوظ رہتا تھا اسے ایک ضخیم نوٹ بک میں لکھ لیا کرتا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں دریائے راوی کے سیلاب کا پانی میرے گھر میں بلائے بے درماں کی طرح داخل ہوا اور صدھا کتابوں کے ساتھ وہ نوٹ بک بھی برباد ہوگئی۔ یہ ملفوظات جو میں ذیل میں درج کر رہا ہوں ان متفرق کاغذات اور پاکٹ بکس میں مندرج تھے جو ایک ٹرنک میں محفوظ تھیں۔

۱ — ۹ مارچ ۱۹۳۰ء — ۶ بجے شام — میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ یاجوج اور ماجوج سے کون اشخاص مراد ہیں؟ فرمایا کہ یہ عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ بابلی زبان کے الفاظ گاگ اور میٹ گاگ کا معرب ہیں۔ بابل (عراق) میں دو طبقے آباد تھے ایک وہ جسکے پاس زمین تھی دوسرا وہ جو اس سے محروم تھا۔ جدید اصطلاح میں جاگیردار اور مزدور طبقہ کہہ سکتے ہیں۔

پھر میں نے حکیم اسپنوزا کا تذکرہ چھیڑا تو علامہ نے فرمایا کہ میری رائے میں اسکی اخلاقی تعلیمات، جناب مسیح کی تعلیمات سے برتر ہیں۔ یہودی قوم میں صرف دو آدمی پیدا ہوئے جنکا نام قیامت تک زندہ رہیگا یعنی جناب مسیح اور حکیم اسپنوزا۔ پھر فرمایا کہ حکیم اسپنوزا ایک اونچی قسم کی وحدۃ الوجود کا قائل تھا۔

جناب مسیح کی ولادت بھی عام انسانوں کی طرح ہوئی تھی۔ میرا یہی خیال ہے مذہب کی بنیاد عقل پر نہیں ہے بلکہ باطنی تجربے پر ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے تجربے کو دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے تو وہ عقل سے کام لے سکتا ہے یعنی ہم عقل کی مدد سے اپنے تجربے کو دوسروں کے لئے قریب الفہم بنا سکتے ہیں۔

مذہب کی غائت ''حضور،، ہے اور یہ کیفیت شعور کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ انسان اس کیفیت کو بذریعہ الفاظ بیان نہیں کرسکتا۔

خدا کا کامل طور سے ادراک کرلینا، عقل کے بس کی بات نہیں ہے انسانی ذہن خدا کا کامل تصور نہیں کرسکتا۔ وہ صرف اسکے مظاہر کا تصور کرسکتا ہے یعنی خدا کا ظہور جسطرح فطرت میں ہوتا ہے بس اسکا ادراک کرسکتا ہے۔

۲ — ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بقائے روح کے مسئلہ پر گفتگو میں فرمایا ''انسان کو اسکے حصول کے لئے جدوجہد کرنی لازم ہے یہ وہ نعمت ہے جو مفت نہیں ملتی صرف وہ لوگ اس نعمت کو حاصل کرسکینگے جو اسکے لئے اپنے آپ کو تیار کرینگے سکرات الموت میں بھی کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ

ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بدولت خودی میں یہ طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ انتشار سے محفوظ رہ سکے،،

پھر فرمایا ''شوپن ہاور کا نظریہ یہ ہے کہ آرزو منبع' شر ہے لیکن میری رائے میں یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ خواہشات کو فنا مت کرو بلکہ ان کو احکام شرع کے تابع کردو،،۔

۳ — یکم اکتوبر ۱۹۳۰ء میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وحدۃ الوجود کے مسئلے پر گفتگو میں فرمایا ''ایک صوفی جب اپنے باطنی واردات کا بیان کرتا ہے تو اسے وحدت وجود سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اسپر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ذات واحد، کائنات کی اصل ہے۔

'دنیا کا کوئی مذہب تصوف کے عنصر سے خالی نہیں ہے حتیٰ کہ سائنس میں بھی تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔

''اسپنوزا، فلسفی تھا، صوفی نہیں تھا کیونکہ صوفی وہ ہے جو وراء العقل ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے۔ اسپنوزا عقلی اعتبار سے حلول (Pantheism) کا قائل تھا۔ لیکن شیخ اکبر ابن عربی رح حلول کے قائل نہیں تھے کیونکہ یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے،،۔

ختم نبوت کے عقیدے پر گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ ''ختم نبوت کے عقیدے کی ثقافتی قدر و قیمت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لئے اعلان فرما دیا کہ آیندہ کسی انسان کے ذہن پر کسی انسان کی حکومت نہیں ہوگی۔ میرے بعد کوئی شخص دوسروں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرلو۔ ختم نبوت ایسا عقیدہ ہے جسکی بدولت انسانی علم کے دائرے کو وسعت نصیب ہوگئی۔

''علی محمد باب کی دریافت یہ ہے کہ (۱) جہاد منسوخ ہوگیا (۲) صاحب الہام کے لئے کسی گرامر (صرف و نحو) کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ یعنی الہام ایسی عبارت میں بھی ہوسکتا ہے جو گرامر کے لحاظ سے غلط ہو،،۔

پھر فرمایا ''حقیقت کا علم انسان کو کئی طریقوں سے حاصل ہو سکتا ہے مثلاً مشاہدات حسی یا مشاہدۂ باطنی (واردات قلبی)

''میں نے کبھی ایسا کوئی شعر نہیں کہا جسے میں نے اپنے قلب میں محسوس نہ کیا ہو اور محض عقل کے زور سے کہدیا ہو۔ یعنی میرے اشعار میں فکر اور جذبہ دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے،،۔

۴ ۔ ۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ مذہب کا دار و مدار عقل پر ہے یا جذبات پر؟ یہ سوال اسلئے کیا تھا کہ چند روز پہلے ایک جرمن عالم الہیات شلائر میخر کی کتاب میں پڑھا تھا کہ مذہب کی بنیاد عقل کے بجائے جذبے (فیلنگ) پر ہے۔ یہ سنکر علامہ نے فرمایا

''یہ سوال ہی غلط ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ جب ایغو (خودی) اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لیتی ہے تو اس میں جذبہ، شعور اور ارادہ، تینوں کار فرما ہوتے ہیں۔ مذہب کا تعلق انسان سے ان تینوں پہلوؤں سے ہے۔ کوئی جذبہ ایسا نہیں ہے جس میں خودی کے دوسرے پہلو (شعور اور ارادہ) شامل نہ ہوں۔ انسان خالص جذبات یا خالص شعور یا خالص ارادے سے نا آشنا ہے۔ مثلاً علم الدین شہید (۱) کا جذبہ اسکی مکمل شخصیت کی گہرائی سے ابھرا تھا اس میں شعور اور ارادہ بھی شامل تھا۔

''ایمان دراصل عمل کی استعداد کا نام ہے۔ اسلام ایسے ایمان کو پسند نہیں کرتا جو انسان کو عمل پر آمادہ نہ کرسکے،،۔

''وحی میں بھی شعور اور ارادے کے عناصر شامل ہوتے ہیں،، ''جو لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں ان میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا دل سوز دروں سے بیگانہ ہوتا ہے یعنی وہ ''متکلم نعش،، ہوتے ہیں،، ''جو آدمی دوسروں کے لئے اسوہ (نمونہ) ہوتا ہے اسکی کوئی پرائیویٹ زندگی نہیں ہوتی،، یعنی وہ خلوت اور جلوت دونوں میں یکساں زندگی بسر کرتا ہے بالفاظ دگر اسکے ظاہر اور باطن میں مطابقت ہوتی ہے۔

---

۱ علم الدین شہید نے ۱۹۲۹ء میں لاہور کے ایک کتب فروش راجپال کو قتل کردیا تھا۔ کیونکہ اسنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ علامہؒ مرحوم تا دم وفات اسکے عشق رسول (ص) کے مداح رہے اور ہمیشہ اسکا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

۵ — اکتوبر ۱۹۳۰ء — میکلوڈ روڈ — ۶ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ مذہب اور نظریہ حلول (Pantheism) میں بنیادی فرق کیا ہے؟ فرمایا کہ نظریہ حلول کی رو سے خدائے مشخص کا وجود نہیں ہے۔ جبکہ مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک شخص (Person) ہے جو سنتا ہے، جواب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں خدا کا تصور انسانی خودی کے رنگ میں کیا جاتا ہے۔ اور ہم ایسا تصور کرنے پر مجبور ہیں۔

ہمارا تصور طاقت (Force) ہمارے تصور ارادہ سے ماخوذ ہے "آخر الامر اثبات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ صرف باطنی تجربہ ہی کسی مذہب کی صداقت کا معیار ہے۔ ہاں جب تم اپنے باطنی تجربے کو دوسروں کو سمجھاؤ گے تو عقل سے کام لے سکتے ہو۔

اثبات دراصل اپنے باطنی تجارب کو دوسروں کو بذریعہ عقل سمجھانے کا دوسرا نام ہے۔

میں نے اسی زمانے میں خطبات مدراس کا پہلی مرتبہ مطالعہ کیا تھا۔ ان خطبات کی خوبیاں بیان کیں تو فرمایا "اگر یہ کتاب المامون کے عہد میں لکھی گئی ہوتی تو تمام دنیائے اسلام میں ایک غلغلہ برپا ہو جاتا"۔

پھر فرمایا "دراصل میری یہ کتاب آئندہ فلسفہ اسلام پر قلم اٹھانے والوں کے لئے ایک مقدمہ کا کام دیگی۔

۶ — ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء میکلوڈ روڈ ۱/۲ — ۵ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملوکیت کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ میں نے یہ دریافت کیا کہ اسلام ملوکیت کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ فرمایا "اسلام کو ملوکیت سے کوئی علاقہ نہیں ہے وہ ملوکیت کی ہر صورت کو مذموم قرار دیتا ہے۔ اسلام میں ملوکیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر فرمایا ملوکیت کی بنیاد، انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے تا کہ دوسروں پر حکومت کرسکے اور اس طاقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرا اس میں شریک ہو۔

ملوکیت کا طریق کار یہ ہے کہ بادشاہ، قوم میں تقسیم اور تفریق کا رنگ پیدا کرتا ہے تاکہ وہ ثالث کا فرض انجام دے سکے اور اسطرح متخاصم جماعتوں کو یقین دلاتا ہے کہ تمہاری عافیت کے لئے میرا وجود ضروری ہے۔

ملوکیت کا ثمرہ یہ ہے کہ محکوم قوم میں (ا) فسق و فجور پیدا ہو جاتا ہے (ب) اعلی ادنی اور ادنی اعلی ہو جاتے ہیں (ج) محکوم قوم رفتہ رفتہ اخلاق حسنہ سے عاری ہو جاتی ہے اس سلسلے میں ملکہ' سبا کا قول لائق مطالعہ ہے :—

قالت ان الملوک اذا دخلوا قریة افسدوھا و جعلوا اعزة اھلھا اذلة"
(۲۷ — ۳۴)

ملکہ نے کہا کہ بلا شک جب بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس میں فساد برپا کرتے ہیں (تباہ کر دیتے ہیں) اور اس شہر کے معزز افراد کو ذلیل کر دیتے ہیں (تا کہ وہ سر نہ اٹھا سکیں)

۲ — ۳ ۱ دسمبر ۱۹۳۰ء میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خدا اور انسان کے باہمی رشتے پر گفتگو چلی تو علامہ نے فرمایا

''حقیقی معنی میں صرف خدا ہی موجود ہے۔ انسان موجود ہونے کی کوشش کر رہا ہے

چو موج می تپد آدم بجستجوئے وجود
ہنوز تا بکمر درمیانہ' عدم است (زبورعجم)

پھر فرمایا :

"God is in effort as seen through man"

پھر فرمایا ''خدا کے سوا اور کوئی شے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے،،

فرمایا کہ ''اس بات کی تائید نہ فلسفے سے ہوسکتی ہے نہ الہیات سے کہ خدا وہاں ہے اور انسان یہاں ہے مطلب یہ ہے کہ خدا اور انسان مدمقابل ہستیاں نہیں ہیں۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی راء فاش تر دیدن بیاموز
اگر زیری ز خود گیری ز بر شو
خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

ہیگل کا نظریہ یہ ہے کہ میرا وجود خدا کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اسکا وجود میرے لئے۔

پھر فرمایا ''موت بھی زندگی ہی کا ایک رخ (aspect) ہے اسلئے اس سے ہراساں نہیں ہونا چاہئیے''

''کوئی شخص ہمہ اوست کا مفہوم لفظوں کے ذریعہ سے دوسرے کو نہیں سمجھا سکتا۔ اسکا تعلق وجدان سے ہے نہ کہ ادراک سے''۔

''اگر ہم خدا، خودی یا کسی اور شے کو جوہر قرار دیں تو ان میں سے کسی کی ہستی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ صفات، جوہر میں پائی جاتی ہیں یعنی وہ قائم بذات غیر ہیں اسلئے کوئی غیر یعنی جوہر ضرور موجود ہے۔ حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اسلئے ہم خدا یا خودی کو جوہر نہیں کہہ سکتے۔

۸ — ۴ ستمبر ۱۹۳۱ء یوم جمعہ — ۵ بجے شام — میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف یکم ستمبر کو لاہور سے روانگی کا قصد کر چکے تھے مگر فوری علالت کی وجہ سے التوا واقع ہو گیا۔

میں نے عرض کی کہ آپ کے الہ آباد کے خطبہٴ صدارت کو میں اپنے اشاعت اسلام کالج کے طلبہ کو سبقاً سبقاً پڑھا رہا ہوں۔ فرمایا تم نے اچھا کیا مگر اس میں دوامی قدر و قیمت (Permanent value) کی چیز تو صرف شروع کا حصہ ہی ہے یعنی اسلام اور قومیت۔ اسے خاص توجہ سے پڑھنا چاہئیے۔ اور اگر ہوسکے تو اسکی شرح لکھنی چاہئیے۔

پھر فرمایا ''شاید مسلمانوں نے کسی سیاسی خطبہ کو اس ذوق و شوق سے نہیں پڑھا ہوگا جیسے اس خطبے کو پڑھا ہے اور نہ اسقدر زیادہ افراد

نے کسی خطبے کو اسقدر لائق اعتناء سمجھا ہوگا۔

میں نے عرض کی کہ ایمان اور عقل میں کیا رشتہ ہے؟ فرمایا "دونوں جداگانہ چیزیں ہیں ۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے معاون ہیں، بعض کی رائے میں عقل بمنزلہ خادم ہے اور ایمان مخدوم ہے ۔ وغیرہ لیکن میری رائے یہ ہے کہ ان کو مخلوط نہ کیا جائے، دونوں اپنی اپنی جگہ رہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ رض نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا : "اسلام یہ ہے کہ تو زبان سے کلمہ شہادت ادا کرے نماز پڑھے روزہ رکھے زکوۃ دے اور اگر استطاعت ہو تو حج کرے ۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تو ایمان لائے اللہ پر ملائکہ پر کتابوں پر رسولوں پر، قدر خیر و شر من اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ پھر انہوں نے پوچھا احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اسطرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ حالت ممکن نہ ہو تو پھر یہ محسوس کر گویا وہ تجھے دیکھ رہا ہے"۔

حدیث بیان کرنے کے بعد علامہ نے فرمایا کہ دراصل یہ اسلام ہی کے تین مراتب ہیں اور ایمان اور احسان میں بہت تھوڑا سا فرق ہے ۔ یہ احسان والی کیفیت ہی دراصل اسلام کی روح ہے اور کیفیت ایمان عمل صالح سے پیدا ہوتی ہے ۔

پھر فرمایا "ایمان کے جسقدر ارکان ہیں وہ سب کے سب، عقل کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں ۔ عقل زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتی ہے کہ ان کے ممکن یا غیر ممکن ہونے کا فتوی دیدے مثلاً

Whether the concept of "God" is logically possible or not.[1]

---

[1] علامہ مرحوم کی عادت تھی کہ اپنی گفتگو میں خصوصاً فلسفیانہ قیل و قال میں اکثر اوقات انگریزی کے جملے بول جایا کرتے تھے ۔ میں نے اُن ملفوظات میں چند جملے بطور یادگار بجنسہ نقل کردئے ہیں میری نوٹ بک میں انگریزی کے بہت سے جملے محفوظ تھے

یعنی تصور ذات باری عقلاً ممکن ہے یا نہیں ؟

اب ظاہر ہے کہ قیامت، حشر و نشر، وزن اعمال، جنت و نار وغیرہ کا ہمیں کوئی شخصی تجربہ نہیں ہے ۔ اسلئے عقل ان امور سے متعلق نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہہ سکتی ۔ وہ تو صرف مادیات میں چل سکتی ہے ۔ یا ان باتوں میں جو ہمارے تجربے یا مشاہدے میں آچکی ہیں ۔ مثلاً جزء اپنے کل سے چھوٹا ہوتا ہے ۔

پھر فرمایا ''جیسا کہ میں کئی دفعہ واضح کرچکا ہوں، ہم خدا کو مجرد عقل سے نہیں پاسکتے (عقل اسکا ادراک نہیں کرسکتی) اسے باطنی مشاہدے یا تجربے کی بدولت جان سکتے ہیں اور مذہب جیسا کہ ارباب علم جانتے ہیں تجارب کے ایک طویل سلسلے کا نام ہے چونکہ خدا لامتناہی (Infinite) ہے اور وہ ہر لمحہ نئی تجلی فرماتا رہتا ہے (کما قال : — کل یوم ھو فی شان یعنی حق تعالے ہر لمحہ اپنی ذات کی نئی تجلی کرتا رہتا ہے) اسلئے اسکی ہستی سے متعلق ہمارے مشاہدات اور تجارب باطنی بھی لامتناہی ہیں ۔ نیز یہ ضروری تو نہیں کہ ہمارا آج کا تجربہ کافی یا آخری یا معیاری قرار پائے ۔ عین ممکن ہے کل ہمیں بہتر اور برتر تجربہ حاصل ہو جائے ۔

پس ثابت ہوا کہ ایمان ایک ترقی پذیر کیفیت ہے جس میں روز بروز اضافہ ہوسکتا ہے ۔ اور یہ بات قرآن حکیم سے بھی ثابت ہے کہ ایمان میں بیشی ہوسکتی ہے : — و اذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایماناً (۸—۲) اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ زیادہ کر دیتی ہیں ان کے ایمان کو ۔

پھر فرمایا ''ہاں عقل کو اس حالت میں مذہبی عقائد یا مسلمات پر تنقید کا حق حاصل ہے جب وہ مسلمات، تحکمانہ (Dogmatic) رنگ میں پیش کئے جائیں مثلاً فلاں بات پر ایمان لے آؤ ورنہ نجات نہیں ہوگی ۔ الحمدللہ اسلام میں کوئی Dogma نہیں ہے یعنی اسلام کسی بات کو زبردستی نہیں منواتا ۔ قرآن جسقدر عقائد تلقین کرتا ہے، ان کی راستی پر دلائل عقلیہ مرتب کرتا ہے ۔

پھر فرمایا ''اگر ایک شخص کو اپنی ذات میں خدا کی ہستی کا تجربہ یا مشاہدہ ہوگیا ہے تو پھر عقل کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس میں

دخل دے۔ اور سچ پوچھو تو عقل کو اس باطنی تجربے اور مشاہدے سے سروکار بھی کیا ہوسکتا ہے؟ یہ تجربہ تو عقل کی رسائی سے بالاتر ہے۔

جب کوئی شخص اچھا شعر کہتا ہے یا اچھی تصویر بناتا ہے تو اسپر تنقید کے لئے کسی مہندس یا منجم کے پاس نہیں جاتا بلکہ کسی شاعر یا مصور کے پاس جاتا ہے۔ لہذا ایک فلسفی یا منطقی، کسی باطنی مشاہدے پر کسطرح تنقید کرسکتا ہے۔ یاد رکھو! مذہبی تجارب (مشاہدات باطنی) عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

آخر میں عود الی المقصود کے انداز میں فرمایا کہ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کو عمل پر آمادہ کردے یعنی مومن وہ ہے جس سے اعمال صالحہ خلوص قلب کے ساتھ سرزد ہوں نہ اسلئے کہ وہ دوزخ سے خوفزدہ ہے یا جنت کا آرزو مند ہے بلکہ اسلئے کہ اسکی ذہنیت ہی ایسی ہوگئی ہے کہ اگر وہ اعمال حسنہ ادا نہ کرے تو اسے راحت قلبی نصیب نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دگر نکوکاری اسکی طبیعت ثانیہ بن جائے۔ کم ازکم میں اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ ایک آدمی مومن بھی ہو اور بدکار بھی ہو۔ ہاں ایک مسلم گناہ کا ارتکاب کرسکتا ہے

۹ — ۲۷ مئی ۱۹۳۲ء ۸ بجے دن میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں رسالہ "نگار"، لکھنؤ بابت ماہ مئی ساتھ لایا تھا۔ اس میں ان کی شاعری پر فنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی گئی تھی۔ اسے پڑھ کر فرمایا، "خدا جانے مسلمانوں کو یہ توفیق کب حاصل ہوگی کہ وہ وزن اور بحر سے بالاتر ہوکر معانی تک پہونچنے کی کوشش کرینگے"۔ اسکے بعد دیر تک شاعری کے مقصد پر گفتگو کی۔

پچھلی ملاقات میں، میں نے عرض کی تھی کہ اسرار خودی کے بعض اشعار آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ چونکہ اس امر کی اجازت دے دی تھی اسلئے آج اسرار خودی بھی ساتھ لایا تھا۔ اشارہ پا کر میں نے پہلا شعر پڑھا:

ع پیکر ہستی ز آثار خودی است الخ

فرمایا "ہر شے میں خودی موجود ہے۔ پتھر کو لے لو۔ اگر تم کمزور

ھو تو تم یہ اٹھائے نہیں اٹھیگا۔ اس میں وزن ہے اور یہی اسکی خودی ہے۔ درخت کو کاٹو تو مشکل سے کٹیگا۔ غرض ہر شے کسی نہ کسی رنگ میں قوت مزاحمت (Power of resistance) رکھتی ہے اور یہی اسکی خودی ہے یہی اسکی ھستی کا ثبوت ہے کہ وہ ہے۔

ع غیر او پیداست از اثبات او

فرمایا کہ ایغو کے لئے غیر ایغو (Non-ego) کا ھونا ضروری ہے جب تک آپ غیر کو ثابت نہ کریں، ایغو کو ثابت نہیں کر سکتے۔ ایغو کو مشخص کرنے کے لئے اسے اغیار سے متمیز کرنا ضروری ہے، اور اس امتیاز کے لئے دوسری اشیاء کا وجود ضروری ہے جنکے مقابلے میں یا موجودگی میں ذھن کسی خاص شے کے وجود کا تصور کر سکتا ہے۔ الغرض انا کے لئے غیر انا کا وجود ضروری ہے

ع باطل از قوت پذیرد شان حق

فرمایا کہ قوت ایسی شے ہے کہ اگر یہ حاصل ہو جائے تو باطل میں بھی حق کی ایک شان پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں شک بھی کیا ہے۔ نصرانیت کو دیکھ لو۔ چونکہ اسوقت اسکے پیروؤں کو قوت حاصل ہے، اسلئے بہتوں کے حق میں باعث مزلت اقدام بنی ہوئی ہے۔

ع زندگانی محکم از لا تقنطو است

فرمایا ''یاد رکھو غم اور خوف یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ خودی کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اور ایک مسلمان جب تک ان دو عیبوں سے پاک نہ ہو جائے حقیقی معنی میں مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے ازالے کی صورت یہ ہے کہ انسان، توحید الہی کو اپنے دل میں پختہ کرلے باین طور کہ پھر شک دل میں راہ نہ پاسکے۔ یعنی اسے یہ یقین ہو جائے کہ جب تک خدا نہ چاہے، کوئی طاقت مجھے نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ پھر اسکے دل میں نہ حزن راہ پا سکتا ہے نہ خوف۔ اگر غیر اللہ کا خوف کسی درجے میں بھی دل میں موجود ہے تو خودی کبھی ہرگز نہیں ابھر سکتی۔

ع بیم غیر اللہ عمل را دشمن است

فرمایا ہم جملہ مظاہر فطرت سے ڈرتے ہیں زلزلے سے، آگ سے، امراض سے،

سانپ سے، تاریکی سے شیر سے وغیرہ۔ محض اسی لئے کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں لیکن اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ موت ایک مرحلہ ہے جو روحانی ترقی کے سلسلے میں لازماً پیش آتا ہے تو ہم موت سے خوفزدہ نہیں ہو سکتے۔ موت بھی زندگی ہی کی ایک شان (Aspect) ہے۔ موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے بلکہ موت وہ دروازہ ہے جس میں ہو کر ہم نئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔

کائنات میں کوئی شے تمہیں نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کائنات سراب (Illusion) ہے بلکہ یہاں جو کچھ ہے مومن کی نگاہ میں اسکی کوئی وقعت نہیں ہے کیونکہ اسکا مطمح نظر بہت بلند ہوتا ہے وہ مادی ساز و سامان سے مطلق مرعوب نہیں ہوتا کیونکہ ہر شے فانی ہے۔

اگر ہم یہ یقین کرلیں کہ کائنات میں یا میں ہوں یا خدا ہے تیسری کوئی ہستی نہیں ہے تو پھر خوف کیسا؟ یعنی ہم مومن اسوقت بن سکتے ہیں جب خدا کے سوا کسی کا وجود ہماری نگاہ میں نہ سمائے۔

ع رمز قرآں از حسین آموختیم

فرمایا کہ تعلیمات قرآنی کی روح یہ ہے کہ مومن وہ ہے جو باطل کا مقابلہ کرے اور مطلق ہراساں نہ ہو یعنی ایسے موقع پر نفع یا نقصان کا خیال دل میں نہ لائے۔ شہید کو شہید اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے معتقدات کی سچائی پر اپنے خون سے گواہی دیتا ہے۔

ایک فرنچ مصنف نے لکھا ہے کہ اسلام ایک آسان مذہب ہے۔ والٹیئر نے اسکے جواب میں یہ کہا کہ اسلام آسان مذہب نہیں ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنا، موسم گرما میں روزے رکھنا، زکوۃ دینا اور حج کرنا یہ باتیں آسان نہیں ہیں۔ میں نے دل میں کہا اسلام کی حقیقت سے نہ معترض واقف ہے نہ مجیب۔ بیشک اسلام نے نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کا حکم دیا ہے مگر اسلام کا نصب العین ان ارکان سے بالاتر ہے۔ نماز پڑھنی آسان ہے مگر باطل کے مقابلے میں صف آرائی ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جان دیدے مگر فرعون کے سامنے سر نہ جھکائے

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

ہمارے زمانے میں انور پاشا شہید نے اسی اصول پر عمل کیا۔ انہوں نے ترکستان میں آزاد اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ مشیت ایزدی کو منظور نہ تھا اسلئے وہ کامیاب نہ ہوسکے مگر انہوں نے روسیوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ بلکہ مردانہ وار موت کو لبیک کہا اور ابدی زندگی حاصل کرلی۔

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مردان جاں سپردن زندگی است

۱۰ — ۳ جون ۱۹۳۲ء — یوم جمعہ — میکلوڈ روڈ — ۵ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باہر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک صاحب سے اپنی کوٹھی کے لئے زمین کی خریداری کے مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو آپ نے حقے کے چند کش لئے اور میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا ''مجھے مسلمانوں کی حالت پر رونا آتا ہے۔ ان میں غیرت کا مادہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اسی لئے انہیں اب اتنی تمیز بھی نہیں ہے کہ جسکی وہ خوشامد کرتے ہیں اس سے انہیں کچھ فائدہ بھی حاصل ہوگا یا نہیں۔ جس شخص کو صاحب اقتدار دیکھتے ہیں اسکی خوشامد کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ مسئلہ کہ جسے وہ فائدہ سمجھتے ہیں دراصل اسکی قیمت (Value) کیا ہے، اسقدر اونچا ہے کہ اس تک ان کے ذہنوں کی رسائی بھی نہیں ہوسکتی۔ اسکے بعد مجھے پڑھنے کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے یہ شعر پڑھا :—

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمد بر فروخت

فرمایا ''اس سے پہلے یہ شعر آچکا ہے :—

عذر ایں اسراف و ایں سنگیں دلی
خلق و تکمیل جمال معنوی

مطلب یہ ہے کہ فطرت بظاہر خونریزی کرتی ہے لیکن جمال باطنی کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے جب ملائکہ نے اللہ تعالےٰ سے عرض کی خلافت ارضی ہمیں عطا کی جائے انسان تو بہت خصیم اور خونریز ہے اور ہم ہر وقت آپکی تسبیح

و تقدیس کرتے رہتے ہیں تو اللہ نے ان کی تردید تو نہیں کی مگر یہ فرمایا ''انی اعلم مالا تعلمون،، یعنی خدا نے اس کائنات کی تخلیق ایک خاص نہج پر کی ہے ۔ خصومت اور فسک دم، دونوں باتیں انسان کی فطرت میں ودیعت کی ہیں ۔ اگر وہ چاہتا تو تکمیل جمال معنوی کے لئے کوئی اور صورت پیدا کرسکتا تھا مگر اسنے یہی پسند کیا کہ جدوجہد اور جنگ و جدل سے جمال کی تکمیل ہو۔ اسی لئے اس نے فرشتوں کو اس کام کے لئے منتخب نہیں کیا کیونکہ ان کے اندر خصومت اور خونریزی کا مادہ نہیں ہے ۔ جبکہ پیکار اور جدال انسان کی سرشت میں داخل ہے ۔

فطرت میں بظاہر خونریزی اور تباہ کاری نظر آتی ہے ۔ بہت ضیاع ہوتا ہے اسکے بعد کوئی عمدہ شے تیار ہوتی ہے ۔ مثلاً لاکھوں پھول آتے ہیں اکثر ضائع ہو جاتے ہیں چند ہی پھولوں پر پھل لگتے ہیں ۔ لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اکثر مر جاتے ہیں کمتر پروان چڑھتے ہیں ۔ اسی طرح خودی کے شعلے نے سینکڑوں ابراہیم پیدا کرکے فنا کردیئے تب، جاکر ایک انسان کامل پیدا ہوا ۔ یہ صورت اسلئے مد نظر ہوئی کہ انسان جدوجہد کرنے کے بعد تکمیل جمال کرسکے ۔

اللہ تعالٰی فرماتا ہے ''خلق فسوی قدر فھدی،، یعنی پیدا کیا پھر درست کیا (مناسب حال صورت بخشی) پھر اندازہ مقرر کیا کہ اس حد تک ترقی ممکن ہے پھر اس حد تک پہونچنے کے لئے ہدایت عطا کی ۔ اسکے بعد آزادی عطا کی کہ جد و جہد کرے زندگی از اول تا آخر عمل سے عبارت ہے ۔ سکون موت ہے ۔

شعلہٴ خود در شرر تقسیم کرد
جز پرستی عقل را تعلیم کرد

فرمایا ''عقل، کل کو نہیں دیکھ سکتی صرف جزء کو دیکھ سکتی ہے ۔ کیونکہ وہ زنجیریٔ زمان و مکاں ہے ۔ کل کو صرف وجدان پاسکتا ہے کیونکہ وجدانی حالت میں نفس ناطقہ، قید زمان و مکاں سے آزاد ہو جاتا ہے ۔

ع علم از سامان حفظ زندگی است

فرمایا : ''علم و فن کا مقصد اصلی، محض آگاہی نہیں ہے بلکہ یہ کہ انسان علم کی بدولت اپنی زندگی اور خودی کی حفاظت کے طریقوں سے آگاہ ہو جائے۔

مذہب کا مقصد بھی یہی ہے۔ جو لوگ "فن برائے فن" کے قائل ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ فلسفہ، آرٹ اور مذہب، اگر خودی کی حفاظت میں معاون نہ ہوں تو بالکل بیکار ہیں۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

فرمایا "خودی کی تربیت میں پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ اسی لئے اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن یعنی احکامِ شرع کی بلا چون و چرا اطاعت کرنی۔ جب انسان احکام شرع کی اطاعت کرتا ہے تو اس میں اختیار کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے یعنی وہ صاحب اقتدار ہو جاتا ہے۔ حقیقی آزادی (حریت) احکام الہی کی تعمیل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

کائنات پر نظر ڈالو۔ جو شے قیمتی اور معزز ہے وہ اطاعت ہی کی وجہ سے ہے۔ ہوا جب پھول میں مقید ہوتی ہے تو خوشبودار بن جاتی ہے۔ اسی طرح مرد مومن، اطاعت سے مراتب عالیہ حاصل کرتا ہے۔ اسلئے مسلمان کو سختی آئین کی شکایت کرنی زیبا نہیں ہے۔ اور نہ آئین میں تاویل کرنی چاہئیے مرشد رومی نے کیا خوب فرمایا ہے :—

می کنی تاویل حرف بکر را
خویش را تاویل کن نے ذکر را

یعنی قرآن کو اپنی خواہشات سے مطابق کرنے کی کوشش مت کرو۔ بلکہ اپنی زندگی کو قرآن کے سانچے میں ڈھالو۔ تاویل سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہونچا۔ تاریخ اس پر گواہ ہے۔

اطاعت سے ضبط نفس کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ انسان دو عناصر سے مرکب ہے خوف اور محبت۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دنیا کی طرف مائل رہتا ہے اور یہ دنیا طلبی اسے فحشاء اور منکرات پر ابھارتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان یہ عقیدہ اپنے دل میں راسخ کرلے کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی مجھے نفع یا نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ "لا الہ" کا عصا اسقدر طاقتور ہے کہ خوف اور محبت کے طلسم کو چشم زدن میں باطل کر دیتا ہے۔ دیکھ لو! حضرت ابراھیمؑ نے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھدی۔ کیوں؟ محض اسلئے کہ انہیں اللہ کے

سوا اور کسی سے محبت نہیں تھی۔ اسی لئے اللہ تعالے نے ان کے اس فعل کو قیامت تک مسلمانوں کے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا کہ مومن وہ ہے جسکے دل میں خدا کے سوا اور کسی کی محبت نہ ہو۔ خالد جانباز رض کو ''سیف اللہ،، کا لقب اسی چیز نے دلایا کہ وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔

آخر میں فرمایا کہ ''لا الہ الا اللہ،، زبان سے مت کہو بلکہ دل سے کہو یعنی اسبات پر کامل یقین رکھو کہ خدا کے علاوہ کوئی ہستی تم پر قاہر اور غالب نہیں ہے۔ جب ماسویٰ اللہ کا خوف اور اس سے امید، یہ دو باتیں دل سے نکل جاتی ہیں تو مسلمان مومن بن جاتا ہے۔

۱۰ اپریل ۱۹۳۳ء

ادارۂ معارف اسلامیہ کے پہلے اجلاس منعقدہ لاہور میں علامہ[1] مرحوم نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھا تھا۔ اس میں سے چند اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں۔

''عصر حاضر کے مسلمان، علم کلام کی بحثوں کے مقابلے میں اسلام کی ثقافتی تاریخ سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اسی لئے مسلمان ملکوں میں ثقافت جدیدہ کے تصورات کو اپنے اندر جذب کرنے کا میلان پیدا ہو گیا ہے،،۔

''انسان نے ہمیشہ سے کائنات میں نظم و ربط باہمی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور قرآنی تعلیمات کی رو سے نظم و ضبط (Order) اس کائنات کی سرشت میں داخل ہے۔ کما قال اللہ تعالے :

''ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت[2] فارجع البصر لاھل تری من فطور (۶۷—۳)

(اے انسان) تو اللہ کی تخلیق میں کہیں تفاوت نہ پاسکیگا۔ (اگر تجھے شک ہو تو) دوبارہ نگاہ (غور) کرکے دیکھ لے، کیا تو کہیں کوئی شگاف (فساد) دیکھتا ہے ؟

''تمام سائنس اس یقین پر مبنی ہے کہ کائنات میں نظم و نسق پایا جاتا ہے چنانچہ جدید سائنس اسی مفروضے سے شروع ہوتا ہے۔ اور اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو پھر علم کا صحیح ذریعہ صرف تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ آیت مذکورہ

---

۳ ۱ ۲

بالا جدید سائنس اور اسلام میں اشتراقی طریق کا سنگ بنیاد ہے۔

سب سے پہلے مسلمان ماہرین فلکیات نے بطلیموسی نظام کی صحت اور واقعیت میں شک کیا۔ اور اسطرح کاپرنیکی نظام کی بنیاد پڑی۔

''موجودہ عہد کے مسلمان علماء اور حکما کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اس مجوسی گرد و غبار کو دور کریں جسنے اسلام کے محاسن کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کردیا ہے،،۔

نوٹ : یہ اس طویل خطبے سے چند اقتباسات درج کئے گئے ہیں جو علامہ مرحوم نے ارشاد فرمایا تھا۔ میں نے یہ فقرے اپنی نوٹ بک میں درج کر لئے تھے اور انہی کا اردو ترجمہ ہدیہ' ناظرین کردیا ہے۔ پورا خطبہ اسی قسم کے فکر انگیز جملوں سے معمور ہے ۱۲

۱۲ — یکم مئی ۱۹۳۳ء میکلوڈ روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں اپنے ساتھ مسلم ریوایول کا دسمبر نمبر لے گیا تھا۔ اس میں علامہ کا وہ لیکچر شایع ہوا تھا جو انہوں نے مجلس ارسطو لندن میں دیا تھا (بعد ازاں خطبات مدراس میں شامل کردیا گیا Is religion possible?)۔ میں نے عرض کی کہ اسکا اردو ترجمہ کرنے کی اجازت دیدیجئے تو فرمایا کہ میں نے پروفیسر سید نذیر نیازی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) سے ترجمہ کے لئے کہدیا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد جناب میکش (مرتضی احمد خاں مرحوم) ملنے آگئے انہوں نے ایسٹرن ٹائمز (اس زمانے میں لاہور سے شائع ہوتا تھا) کے ایک مضمون کو علامہ کے سامنے پیش کیا۔ پڑھ کر فرمایا بڑا افسوس ہے کہ روسی مسلمانوں پر عرصہ' حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اسکے لئے تو مسلمانان عالم کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔

اس مضمون کو پڑھ کر کمیونزم اور بالشویزم پر تبصرہ فرمایا اور اس ضمن میں جاوید نامے سے چند اشعار جو ان تحریکوں سے متعلق ہیں پڑھ کر سنائے۔

اسکے بعد مسٹر نور احمد چیف رپورٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ملنے آگئے۔ ان سے تھوڑی دیر تک بعض سیاسی مسائل پر گفتگو ہوئی وہ چلے

لائے تو علامہ نے میکنش صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا ''چند روز ہوئے سردار عبدالرسول خاں اور ان کے ایک دوست میرے پاس آئے تھے کہتے تھے کہ وہ دونوں ابھی فریضۂ حج سے فارغ ہو کر آئے ہیں۔ سلطان ابن سعود نے بہت برا کیا کہ زائرین کو روضۂ اقدس کی جالیوں کو بوسہ دینے سے روک دیا۔ مجھے سلطان نے عصرانے پر مدعو کیا تھا لیکن میں نے انکی دعوت اسلئے رد کردی کہ انہوں نے ہمارے جذبات کا احترام نہیں کیا۔

یہ سنکر میکش کہنے لگے کہ میری رائے میں سلطان نے بہت اچھا کیا کیونکہ جالیوں کو بوسہ دینا ایک مشرکانہ فعل ہے۔ اسپر علامہ نے فرمایا کہ میں اس بات میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ اگر کوئی شخص فرط محبت سے اپنے بیٹے کو سینے سے لگالے اور اسکی پیشانی چوم لے تو یہ شرک کیسے ہوگیا؟ یہ تو اظہار محبت ہے۔ اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارکہ کی جالیوں کو چومنا، مشرکانہ فعل نہیں ہے بلکہ حضور انور سے محبت کا اظہار ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں خدای صفات تسلیم کرتا ہے یا آپ کو الوہیت میں شریک کرتا ہے تو وہ بلا شبہ مشرک ہے۔ مجھے بخوبی معلوم ہے کہ جو مسلمان جالیوں کو چومتے ہیں وہ فرط محبت و عقیدت سے ایسا کرتے ہیں اور یہ فعل مشرکانہ نہیں ہے۔

اسپر میکش کہنے لگے کہ محبت یہ نہیں ہے کہ جالیوں کو بوسہ دیا جائے محبت یہ ہے کہ محبوب کے Cause (مقصد حیات) کی حمایت کی جائے یا اسکی اتباع کی جائے۔ یہ سنکر علامہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ آپ کو یہ غلطی، محبت کے مدارج میں امتیاز نکرسکنے کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے محبت کے مختلف مدارج ہیں۔ اگر ایک شخص محبت میں اسقدر بلند مرتبہ حاصل کرلے کہ محبوب کے رنگ میں رنگین ہو جائے یا اسکے لئے اپنی جان قربان کردے تو یہ اسکی انتہائی خوش نصیبی ہے۔ مگر سب لوگ اس بلند مرتبے تک نہیں پہونچ سکتے۔ جو شخص اپنے محبوب کے لئے جان نہیں دیسکتا ظاہر ہے کہ اسکی محبت ادنی درجے کی ہے لیکن آپ اسکی محبت کی مطلق نفی نہیں کرسکتے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے اسے سرے سے محبت ہی نہیں۔

''آپ محبت کو منطق کے پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ اصول ہی غلط ہے۔ محبت، منطق سے بالاتر ہے۔ یہاں Higher Logic کی حکومت

ہے - ارسطو اور مل کی منطق بیکار ہے - محبت کیا شئے ہے ؟ لفظوں کے ذریعہ سے اسکا اظہار بہت مشکل ہے - اور محبت کا تجزیہ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے - ع ذوق این بادہ ندانی بخدا تا نچشی والا معاملہ ہے۔اسکا تعلق دماغ سے نہیں ہے دل سے ہے - اگر آپ کے وضع کردہ اصول کو صحیح تسلیم کرلیا جائے کہ جو شخص جسقدر زیادہ متبع رسولؐ ہے اسی قدر زیادہ رسولؐ سے محبت کرتا ہے یعنی اگر محبت کا معیار، اتباع رسولؐ قرار دیا جائے تو آپ علم الدین شہید کے بارے میں کیا کہینگے ؟ وہ تو نماز کا بھی پابند نہ تھا اتباع رسولؐ تو بڑی چیز ہے ؟

دراصل یہ سب کچھ، انسان کے مزاج (Temperament) پر موقوف ہے۔ بعض لوگوں کی عقل ان کی محبت کے تابع ہوتی ہے اور بعض کی محبت ان کی عقل کے تابع ہوتی ہے - اور دونوں قسم کے آدمی دنیا میں پائے جاتے ہیں - مثلاً حضرت علی رضؓ اگرچہ علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند مرتبے پر فائز تھے لیکن حب رسولؐ کا جذبہ ان کی عقل پر غالب تھا - وہ بعض باتیں ایسی کرتے تھے جن پر منطقی اعتراض وارد ہوسکتا ہے مثلاً وہ جب کبھی اس درخت کے نیچے سے گذرتے تھے جسکے نیچے سے ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم گذرے تھے، تو جھک کر گذرتے تھے حالانکہ وہ قصیر القامۃ تھے اسلئے اسکی مطلق ضرورت نہ تھی، جب لوگوں نے سبب دریافت کیا تو کہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جھک کر گذرے تھے - میں جھک کر، اپنے محبوب کے فعل کی تقلید کرتا ہوں -

دوسری مثال حضرت بایزید بسطامی رحؒ کی ہے جنہوں نے ساری عمر خربوزہ نہیں کھایا کیونکہ انہیں کوئی حدیث ایسی نہیں ملی جس سے حضورؐ کا خربوزہ کھانا ثابت ہو جاتا - اسی لئے میں نے لکھا ہے -

کامل بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

ان کے برعکس، حضرت فاروق اعظم رضؓ کی عقل ان کی محبت پر غالب تھی اسی بناء پر انہوں نے وہ درخت کٹوا دیا جس کے تنے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پشت مبارک لگائی تھی - اگر انکی محبت علی رضؓ کی محبت کی طرح ہوتی تو ہرگز وہ درخت نہ کٹواتے -

قصہ مختصر، علی رض اور عمر رض دونوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی لیکن طبائع کے اختلاف کی بناء پر انکی محبتوں کی نوعیت اور کیفیت جداگانہ تھی۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی افتاد طبع کی روشنی میں جو رنگ مرغوب نظر آئے اختیار کرلے۔ اس میں کسی مباحثے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ گنجایش ہی نہیں ہے۔

چونکہ حضرت علی رض کی محبت Human type عام انسانی ٹائپ کی ہے اسلئے وہ عموماً لوگوں کو اپیل کرتی ہے۔ حضرت عمر رض کی محبت Superhuman type فوق البشر نوعیت کی ہے اس لئے بہت کم لوگوں کو پسند آتی ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ عموماً لوگوں پر جذبات کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ عقلی ٹائپ کے آدمی بہت کم ہوتے ہیں۔

دیکھ لو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بمقابلہ دیگر پیشوایان مذاہب عالم، مسلمانوں کو زیادہ اپیل کرتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ ہم میں ہی سے ہیں ''قل انما انا بشر مثلکم،،۔

تصور ذات باری تعالی کا ذکر آیا فرمایا قرآن مجید کا پیش کردہ تصور ہمیں زیادہ اپیل کرتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دونگا۔ ''ادعونی استجب لکم،، گویا اسطرح بندے اور خدا (عابد اور معبود) میں ایک روحانی رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور یہ رابطہ ہی مذہب کی جان ہے۔

معتزلہ کا پیش کردہ تصور باری، عام مسلمانوں کو اپیل نہیں کر سکتا کیونکہ انکی رو سے خدا نہ سمیع ہے نہ بصیر نہ علیم ہے نہ مجیب۔ بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ ایسے خدا کو ماننے کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ع خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

۱۳ — ۱۸ فروری ۱۹۳۸ء میکلوڈ روڈ

ایک عرصے کے بعد حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ غزنی کے رہنے والے ایک احمدی بزرگ عبدالقادر نامی بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت علامہ نے انہیں مجھ سے متعارف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ صاحب ۱۹۱۸ء

میں ہندوستان آئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد قادیانی مذہب اختیار کرلیا اسلئے افغانستان واپس نہیں گئے۔ آجکل احمدیہ بلڈنگس میں مقیم ہیں اور گاہے گاہے میرے پاس آتے رہتے ہیں۔

اس تعارف کے بعد انہوں نے علامہ سے کہا کہ مسلمانان عالم کے ادبار سے میرا دل خون ہورہا ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس قوم سے اپنی توجہ بالکل ہٹا لی ہے (ان کے الفاظ یہ تھے کہ مونہہ موڑ لیا ہے)۔

علامہ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ خدا نے ان سے مونہہ نہیں موڑا بلکہ خود انہوں نے قرآن سے مونہہ موڑ لیا ہے اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔ میں یہ بات آج سے بیس سال پہلے کہہ چکا ہوں ۔

ع اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

تاہم جائے شکر ہے کہ ابھی انکی حالت ہنود یا یہود کی سی نہیں ہوئی ہے علاوہ بریں مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ انہیں دوبارہ عروج حاصل ہوگا۔ خدا نے ۱۹۱۰ء میں ایک موقع دیا تھا مگر افسوس ۔

اسکے بعد عبدالقادر صاحب نے مسیح اور مہدی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اسپر علامہ نے فرمایا کہ میری رائے میں مسیح اور مہدی کے نزول کا تخیل سراسر غیر اسلامی ہے۔ قرآن حکیم میں ان بزرگوں کی دوبارہ تشریف‌آوری کا کوئی تذکرہ نہیں ہے صحیح بخاری میں نزول مہدی کا مطلق ذکر نہیں ہے ہاں مسیح کی آمد ثانی سے متعلق دو حدیثیں ضرور موجود ہیں مگر جب قرآن میں انکی آمد ثانی کا کوئی وعدہ نہیں ہے تو لامحالہ ان کو ناقابل اعتماد قرار دینا پڑیگا مسیح اور مہدی کا انتظار کرتے رہنے کے بجائے خود مسلمانان عالم ہی وہ کام کیوں نکریں جو وہ مسیح اور مہدی سے متعلق سمجھتے ہیں۔

میں نے علامہ کی توجہ شری جواہر لعل نہرو کی خود نوشتہ سوانح حیات میں اس عبارت کی طرف مبذول کی جس میں انہوں نے Organised Religion سے اپنی نفرت اور اسکی ضرر رسانی کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا ''پنڈت جی نے

مذہب سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جو لوگ مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہیں وہ عموماً یہی کہتے ہیں کہ وہ تعصب اور تنگدلی سکھاتا ہے۔ حالانکہ موجودہ نیشنلزم (وطنیت کا نظریہ) مذہب سے زیادہ تعصب اور تنگدلی سکھاتا ہے موجودہ زمانے میں جنگوں کا سبب یہی نیشنلزم ہے۔ مذہب کو ارباب سیاست نے ہمیشہ اپنے مقاصد مشترمہ کے لئے استعمال کیا ہے۔ حروب صلیبی کی تہ میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ ارباب سیاست مذہب کے نام پر لوگوں کو لڑاتے ہیں اور مخالفین مذہب کو یہ کہنے کا موقع ملجاتا ہے کہ مذہب خونریزی کراتا ہے۔ ارباب اقتدار کا شیوہ یہ ہے کہ وہ پہلے جنگ کو عوام کی نظروں میں مقدس بناتے ہیں پھر انہیں اپنا سر کٹانے کے لئے میدان جنگ میں بھیجتے ہیں۔ یعنی مذہب کو ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

گذشتہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ برہمنوں نے بودھ دھرم کو اس بناء پر ہندوستان سے خارج نہیں کیا کہ وہ اصولاً اس کے مخالف تھے بلکہ محض اسلئے کہ اسکی وجہ سے انکا اقتدار خطرے میں پڑگیا تھا ورنہ بودھ دھرم تو ویدانت کی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔ غور کرو! جب ہر شخص کی آتما یکساں ہے تو پھر ذات پات اور چھوت چھات کیسی؟ ویدانت کی تعلیم کا منطقی نتیجہ مساوات نسل انسانی ہے اور بودھ دھرم نے ویدانت کے اسی نتیجے کو ہندوؤں میں عام کرنے کی کوشش کی تھی جسکی پاداش میں اسے خارج البلد بلکہ خارج الوطن کردیا گیا۔

اسکے بعد ہندوستان کے سماجی حالات سے متعلق گفتگو رہی بعد ازاں گفتگو مذہب کی طرف آگئی۔ فرمایا کہ نبی اور مجدد میں کئی پہلوؤں سے فرق ہوتا ہے مگر سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ دونوں کی ذہنی کیفیات مختلف النوع ہوتی ہیں۔ اسی طرح مشاہدۂ باطنی میں بھی کیفیت کا فرق ہوتا ہے آخر میں فرمایا کہ اگر تم میرے مضمون اسلام اور احمدیت کا اردو ترجمہ شائع کرو تو اسپر حواشی بھی لکھنا اور خصوصاً بروز کے عقیدہ کی وضاحت کر دینا۔"

۲۱ — ۲ ستمبر ۱۹۳۶ء جاوید منزل میئو روڈ ۹ بجے شام

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی پستی کا ذکر چلا تو فرمایا "پنجاب کے مسلمان اب تک کوئی انگریزی روزنامہ نہیں جاری کرسکے۔

اس سے ان کی قومی زندگی کی پستی اور زبوں کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ مسلمان امراء مشاغل لاطائل پر لاکھوں روپے خرچ کرسکتے ہیں لیکن قومی کاموں کے لئے ان کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔ مجھے سالہا سال سے مسلمانوں کی اس ذہنیت کا تجربہ ہے۔ پھر فرمایا "انگلینڈ کی (Set Policy) سوچی سمجھی ہوئی حکمت عملی یہ ہے کہ کوئی ایسی تحریک جو اسلامی ممالک کو متحد کرسکے، کامیاب نہ ہونے دی جائے۔ برطانیہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اسلامی ممالک میں بیداری پیدا ہو اسے ہر وقت پین اسلامزم کا خوف دامنگیر رہتا ہے۔

اسکے بعد نیازی صاحب آگئے۔ انہوں نے لانث سے چند اقتباسات علامہ کو سنائے۔ انپر علامہ نے تبصرہ فرمایا اس ضمن میں یہ بھی فرمایا "بروئے قرآن وحی و الہام کسی خاص قوم یا ملک یا نسل سے مختص نہیں ہے الہام تمام زندہ ہستیوں کا مشترکہ سرمایہ ہے شہد کی مکھی بھی اس نعمت سے سرفراز ہوسکتی ہے۔ اور سائنسدان بھی الہام کے محتاج ہیں۔ دنیا میں جسقدر عظیم ایجادات ہوئی ہیں وہ سب الہام کی بدولت ہوئی ہیں نہ کہ ریسرچ کی بدولت۔ نیز انسان اپنی زندگی کے اکثر معاملات Inspiration الہام ہی کے تحت طے کرتا ہے۔ میری رائے میں نزول مسیح کا عقیدہ مجوسیت کی راہ سے مسلمانوں میں آیا ہے۔ کسی زمانے میں "انتظار" عوام الناس کے لئے مفید تھا لیکن ختم نبوت کے بعد کسی کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔

ہوئی جسکی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

۱۶ — ۱۰، اکتوبر ۱۹۳۶ء جاوید منزل میو روڈ

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ادبی تنقید کا ذکر نکلا تو فرمایا "جہاںتک صحیح تنقید کا سوال ہے، ہندوستان ابھی مغرب سے سو سال پیچھے ہے۔ ہندوؤں میں تو کچھ حقیقت پسندی پیدا ہو چلی ہے لیکن مسلمانوں میں ابھی تک رومانیت کا اثر باقی ہے۔ گذشتہ پانچ سو سال میں مسلمانوں کے آرٹ، لٹریچر اور شاعری کا رجحان یہ رہا ہے کہ حقائق سے گریز کیا جائے اور خیالی دنیا میں زندگی بسر کی جائے۔

ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ مسجد قرطبہ کو دیکھکر آپ پر کیا اثر

ہوا؟ میں نے کہا It is a commentary on the Quran written in stones
یہ قرآن کی وہ تفسیر ہے جو ہتھوڑوں کے ذریعہ سے لکھی گئی ہے۔

پھر فرمایا ''میری شاعری کو شعر کے معیار پر جانچنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اسرار خودی سے لیکر بال جبریل تک ہر کتاب میں میں نے یہی لکھا ہے کہ شاعری میرے لئے مقصود بالذات نہیں ہے میں تو مسلمانوں کے سامنے حقائق حیات بیان کرتا ہوں اور انہیں مشکلات زندگی کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ لیکن مسلمانوں پر گذشتہ تین سو سال سے رومانیت کی وجہ سے ایسا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اگر کوئی شخص انہیں بذریعہ شعر حقائق حیات کی طرف دعوت دے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر انکی نظر میں شاعری وہ ہے جس میں خلاف عقل اور تخئیلی باتیں ہوں جنکو حقیقت سے کوئی سروکار نہ ہو۔ ''خدا مست،، کی ترکیب پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ ترکیب اساتذہ کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ یہ غور نہیں کرتے کہ اقبال کا پیغام کیا ہے؟

اقوام کے عروج و زوال کے اسباب بہت مخفی ہوتے ہیں اسلئے ان کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے ہم کو جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ علامات ہیں نہ کہ اسباب۔

قومی عروج انتہائی نظم و ضبط کی صفت پر موقوف ہے۔ظاہر ہے کہ قانون کی اطاعت بہت مشکل چیز ہے اور اسکے لئے بڑی ہمت درکار ہے۔ جو قومیں رو بزوال ہیں وہ محنت اور پابندیوں سے گھبراتی ہیں جس طرح مریض طبیب کے احکام کی تعمیل سے گریزاں ہوتا ہے۔نتیجہ ظاہر ہے کہ مرض بڑھتا جاتا ہے۔

۱۵ — ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہاد پر گفتگو چلی اس ضمن میں فرمایا ''جہاد کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اگر ایک شخص اپنے ایمان، اپنے تمدن اور اپنے وطن کی حفاظت یا حمایت میں تلوار بلند نہیں کر سکتا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ پھر تلوار کا اور مصرف کیا ہے؟ جب کبھی مسلمان کا دین خطرہ میں ہو اسپر تلوار اٹھانا فرض ہے اگر وہ اس مقدس فرض کی انجام دہی کے لئے بھی تلوار نہیں اٹھاتا تو پھر اسکی تلوار اسکے کس دن کام آئیگی؟

جہاد، اگر جوع الارض کے لئے ہو تو حرام ہے لیکن اسلام کی حفاظت کے لئے جہاد کرنا پہلے بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے ''جو قیصر کا حق ہے وہ قیصر کو دو،، یہ خالص رومن پروپا گنڈا تھا۔

۱۸ — ۹ نومبر ۱۹۳۶ء جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ میں نے سوال کیا کہ آجکل ھندوستان میں بیکاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے آپ کی رائے میں اسکا حل کیا ہے ؟ فرمایا

(ا) جبتک ھم انگریزوں کی غلامی میں ھیں

(ب) سرمایہ داری ھم پر مسلط رھیگی

(ج) فوج پر ملکی محاصل کا کثیر حصہ خرچ ہوتا رھیگا

(د) خود مسلمان رسوم لایعنی پر اسراف بیجا کرتے رھینگے

اسوقت تک کوئی صحیح حل دستیاب نہیں ھوسکتا۔

۱۹ — ۲۰ نومبر ۱۹۳۶ء جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے سوال کیا کہ شفاعت کے بارے میں آپکی کیا رائے ہے ؟ فرمایا ''انسانی فطرت کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ سہارا تلاش کرتی ہے۔ سابقہ ادیان نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ''شفیع،، کا تصور پیش کیا اور کہا کہ ھمارا مذھب قبول کرلو گے تو ھمارے مذھب کا بانی تمہاری شفاعت کردیگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوت عمل کمزور ھوگئی اور عوام، مذھبی پیشواؤں کے غلام ھوگئے۔ اسلئے اسلام نے اگر شفاعت کا تذکرہ بھی کیا تو الا باذنہ،، کی قید لگادی یعنی قیامت کے دن، اللہ کے حکم کے بغیر، کوئی شخص کسی کی شفاعت (سفارش) نہیں کرسکیگا۔ تاکہ قوت عمل مردہ نہ ھو جائے۔ اسلام میں سب سے بڑا شفیع خود انسان کا عمل صالح ہے۔

لیس للانسان الا ماسعی — انسان کو وھی ملیگا جسکے لئے اسنے جدوجہد کی ہے شفاعت بمعنی کفارہ تو صریحاً خلاف اسلام ہے لیکن سفارش پر کوئی منطقی اعتراض نہیں ھوسکتا۔ کیونکہ خدا کے حضور میں کسی نیک بندے کا کسی گناہ گار کے لئے سفارش کرنا نہ عقلاً معیوب ہے نہ نقلاً مذموم ہے۔

فرمایا ''مجھے تو اب یہ خیال ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دینی اصلاح ممکن بھی ہے یا نہیں ؟ وہ تو غیر اسلامی عقائد اور رسوم کے اسقدر خوگر ہو چکے ہیں کہ اب حقیقی اسلام سے انہیں تسلی نہیں ہوسکتی''۔

فرمایا ''ہندی مسلمان کی ذہنی پستی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ وہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ کہیں میری یا قوم کی تضیع اوقات کا موجب تو نہیں ہو جائیگا۔

فرمایا ''لوگوں میں اس بات کا احساس بھی باقی نہیں رہا کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے ہمیں یا قوم کو فائدہ پہونچیگا یا نقصان ؟

فرمایا ''چند روز ہوئے ایک شاعر میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھے اپنے اشعار میں تصرف کی اجازت دیدیجئے۔میں نے کہا '' بندۂ خدا ! مجھ پر کیوں ظلم کرتے ہو؟ خود ہی اپنے مطلب کے اشعار کیوں نہیں تصنیف کر لیتے ؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آجکل ہر شخص صاحب تصنیف بننا چاہتا ہے اور یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ مجھ میں تصنیف کی اہلیت بھی ہے یا نہیں؟ کسقدر تکلیف دہ ہے ایسے ماحول میں رہنا !

۲۰ — ۱۷ دسمبر ۱۹۳۶ء جاوید منزل

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اسوقت باہر صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے مسئلہ تجسیم پر گفتگو ہوئی ۔ فرمایا کہ دیگر مذاہب نے خدا کو اتنا پست کیا کہ وہ انسان کی سطح پر آگیا لیکن اسلام نے انسان کو اتنا بلند کیا کہ مظہر صفات بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اگر بشکل انسان جلوہ گر ہو تو وہ خدائی صفات سے معریٰ ہوجائیگا اسلئے ہم اسے خدا نہیں کہہ سکتے ۔

اسکے بعد ماسٹر عبداللہ چغتائی علامہ سے ملنے آگئے وہ فرانس جا رہے ہیں علامہ ان کو مفید مشورے دیتے رہے چلتے وقت انہیں دعا دی اور کہا اگر اللہ نے مجھے صحت عطا فرمادی تو ۱۹۳۸ء میں حج کرنے جاؤنگا ۔

۲۱-۷-۱۹۳۷ء (نوٹ بک میں تاریخ درج نہیں ہے غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا)

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سوال کیا کہ جمہوریت کے بارے میں اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ فرمایا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ امیر کے لئے مقدم شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کی حمایت کریگا خواہ وہ عرب ہو یا عجمی، اسلام نے جمہوریت کی روح اختیار کی ہے اور وہ ''شوریٰ'' ہے۔ اسلام نے دنیا کو جمہوریت کی روح سے روشناس کیا اسی لئے اسلام نے وحی کا سلسلہ بند کردیا تاکہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی انسان کے سامنے سر تسلیم خم نکریں۔ بنی آدم کو حریت کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لئے، وحی کو ختم کرنا لازمی تھا۔ اسلام نے اسی لئے ملوکیت، احبارت اور نبوت کو ختم کردیا تاکہ انسان آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوسکے۔ اسکے علاوہ انفرادی ذمہ داری کا قانون نافذ کیا لاتزر وازرۃ وزر اخری کوئی شخص کسی شخص کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

اسلام میں امارت بھی نکاح کی طرح ایک عمرانی معاہدہ ہے، امیر اور قوم کے درمیان۔ عوام نے ایک شخص سے کہا کہ اگر تم شریعت کی پابندی اور اسکے نفاذ کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں اپنا امیر منتخب کرتے ہیں۔ اس شخص نے وعدہ کیا کہ میں ایسا ہی کرونگا۔ بس وہ قوم کا امیر منتخب ہوگیا۔ اگر وہ خلاف ورزی کرے تو قوم کو اسکے خلاف بغاوت کا حق حاصل ہے۔

اسلامی جمہوریت میں رائے دہی کے لئے کلمہ شہادت ادا کرنا کافی ہے مغربی جمہوریت میں برسر اقتدار پارٹی عوام کو فریب دیتی ہے کہ تم حکمراں ہو حالانکہ دراصل زمام کار چند افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو پرائم منسٹر کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء کی جنگ میں دراصل انگلستان کا وزیر اعظم، اس ملک کا حکمراں تھا۔ نام عوام کا تھا۔

حرف آخر

ان ملفوظات میں بعض مقامات میں عبارت غیر مربوط ہوگئی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ میں نے قصداً وہ باتیں حذف کردی ہیں جنکا تعلق مسلمانوں کے مختلف فرقوں یا جماعتوں سے ہے۔

مجھے برسوں علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ ۱۹۳۵ء

اور ۱۹۳۶ء میں جبکہ وہ انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے اور میں انجمن کے قائم کردہ اشاعت اسلام کالج کا پرنسپل تھا۔ مجھے بہت زیادہ انکی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا کیونکہ انہیں اس کالج سے بہت دلچسپی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کالج ۱۹۲۹ء میں ان کی اور غلام بھیک نیرنگ مرحوم کی متفقہ کوشش ھی سے قائم ھوا تھا۔

ان کی زندگی کے بہت سے واقعات آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ھیں اور ان کی یاد اسقدر روشن ہے کہ بائیس سال گذر جانے کے بعد بھی وہ مدھم نہیں پڑی اگر مدیر محترم نے ارشاد فرمایا تو میں انہیں جداگانہ مضمون کی صورت میں قلمبند کردونگا — انشاء اللہ و بتوفیقہ